فہمیدہ ریاض

پلوشے مسکراؤ

(افضل بنگش کی بیٹی کے لئے)

آنسوؤں کی چلمن سے جھانکتی ہوئی بیٹی!
کیوں اداس ہوتی ہو
کس لیے سمجھتی ہو جہد زندگی ساری
تھی تمھارے بابا کی
ایک کاوش بے سود
کیونکہ لوگ کہتے ہیں

لوگ سچ نہیں کہتے
تم مرے گلے لگ جاؤ
آؤ مل کے ہم سوچیں
جھوٹ کیا ہے اور
سچ کیا

بھید ہے کوئی گہرا ہم تلک جو آیا ہے
زندگی کا یہ اسرار کون جان پایا ہے
آدمی کی آنکھوں میں کیسے خواب اترتے ہیں
ان کے صدق پر انساں کیوں یقین کرتے ہیں
اک ادھورے خاکے میں اپنا خون دل لے کر
کیسے رنگ بھرتے ہیں
اک اندھیرے رستے سے شعلہ ساں گزرتے ہیں

جیسے اك رواں مشعل!

تھے تمہارے بابا بھی اس طرح کے ایك انسان

سوچتے تھے کیا آخر؟
بس یہی کہ دھرتی پر بھوك کے شکنجے میں
مفلسی کے پنجے میں خلق تلملائے کیوں
صرف چند لوگوں کے عیش کا ہے ساماں کیوں
ہر خزینہ دھرتی کا
روز و شب کی محنت کا صرف بھوك حاصل کیوں
کس لیے رہیں محروم جو نمك ہیں ساگر میں
جو پسینہ دھرتی کا

کیوں نہ آئے دنیا میں وہ خوشی جو سب کی ہو
زندگی جو سب کی ہو!

ضبط جوش گریہ سے کانپتی ہوئی بیٹی
اپنی بھیگی آنکھوں سے تم جدھر نظر ڈالو
زندگی کا ہنگامہ ہے اسی طرح برپا
اس حسین کرّے کے دل میں جو خزانے ہیں
ان سنہرے خوشوں میں جس قدر بھی دانے ہیں
اس قدیم دولت کی مشترك وراثت پر
خلق کی مشقت پر

صرف چند لوگوں کی جو اجارہ داری ہے
اس کی جنگ جارہی ہے

حرص بھی ہوس بھی ہے آدمی کی طینت میں
اور اسی کی فطرت میں، عشق آدمیت بھی
یہ معمہ ہستی، منصفی کی چاہت بھی
ان میں جب بھی ہو پیکار اس کا آخری گھمسان
روح سے گزرتا ہے
خون میں بپھرتا ہے
کش مکش میں ہیں انسان

''زندگی جو سب کی ہو''

''وہ خوشی جو سب کی ہو''
آہ ذہن انساں میں یہ خیال کیوں آیا
اک جنون ہے شاید یا کوئی بگولہ ہے
لے اُڑے گا جو ہم کو آتشیں فضاؤں میں
اس کی جد کرنے پر کھال ادھیڑدیتے ہیں
کھینچ لیتے ہیں ناخن
پھر بھی آدمی اس کو ترک کیوں نہیں کرتا
بھول کیوں نہیں جاتا

کیا ہے یہ؟ نہ جانے کیا ...
یہ مآل ہے شاید بے شمار صدیوں کا
جو اندھیرے غاروں سے بستیوں میں لاتا ہے
جنگلوں کے سب قانون ذہن سے مٹاتا ہے
دوسروں کے دکھ پرجو اشکبار کرتا ہے
آدمی کی ذلّت پر بے قرار کرتا ہے
جس کو ہم کہیں تہذیب ، شاید اس کا حاصل ہے
یا کوئی انوکھی آگ آدمی کی ہستی میں

جس طرح کوئی معبود ، لازوال
– نادیدہ

برگ گل پہ شبنم سی کانپتی ہوئی بیٹی
ان طویل راہوں سے یوں ہجوم گزرے ہیں
ڈھونڈنے پہ بھی ان کے نقش پا نہیں ملتے
ہاں کوئی کوئی انساں خاک سے اُٹھا ایسے
جیسے جاگتی ہو آگ

جیسے گونجتا ہو راگ آسماں کی وسعت میں
جیسے اک رواں مشعل

لمحہ بھر جھمکتے ہیں راستے کے پیچ اور خم
جس کی روشنی میں ہم
اک کتاب پڑھتے ہیں
یا کسی ہتھیلی پر دیکھتے ہیں اک ریکھا
یا اندھیرے کونوں میں پھر سے ڈھونڈ لیتے ہیں
کوئی گم شدہ خواہش
کوئی سرنگوں ارمان
ہاں! کوئی کوئی انسان ...
ایسے بے بہا موتی ہر جگہ نہیں ملتے
موج بحر سے یوں تو ان گنت صدف نکلے

لوگ سچ نہیں کہتے
روزو شب جو رہتے ہیں رزق کی کشاکش میں
وہ سمجھ نہیں سکتے
کش مکش سے نابینا جان بھی نہیں سکتے

مان بھی نہیں سکتے
کس طرح کوئی انسان جیل کے اندھیروں میں دن گزارسکتاہے
کھال جب ادھڑتی ہو
کھینچتے ہوں جب ناخن
اس گھڑی کوئی کیسے اپنی کشتئ دل کو
اك مہیب دریا کے پار اتار سکتا ہے
اك خیال کی خاطر جان ہارسکتا ہے
وہ سمجھ نہیں سکتے ، راز ہے جو انساں کا
بس خدا سمجھتا ہے جس کا راز ہے انساں
مڑ کے اب ذرا دیکھو
وہ تمہارے بابا ہیں
دیس دیس بکھرے تھے اُن سے دوسرے کتنے
اس طرح رہے تا عمرسوختہ تنوں کے گرد روشنی کا ہالہ ہے
شاندار ماضی کا آج تك اجالا ہے
اور تمہاری مژگان پر کانپتا ہے اك آنسو
اس میں ہے نہاں پر تو اس نئے اجالے کا
کل جو آنے والا ہے۔